فرانسس روبنسن (F. Robinson)
ترجمہ افتخار شروانی

اکیسویں صدی اور اُمّتِ مسلمہ

سنہ ۲۰۰۰ء میں مسلم دُنیا کی حالت پر غور کرنے کے لیے اس کا پچھلی دو صدیوں کی ابتداء کی صورتِ حال سے موازنہ مفید ثابت ہوگا۔

اُنیسویں صدی کے شروع میں مسلم دنیا کے وہ ایک ہزار سال ختم ہو گئے تھے، جن میں یہ طاقت کا سرچشمہ تھی، اس زمانے میں ایک کل دنیا اسلامی نظام موجود تھا جس کی بنیاد وہ طویل تجارتی شاہ راہیں تھیں جو ایشیا سے افریقہ تک اور سمندروں کو پار کرتی ہوئی، بحیرۂ احمر سے بحیرۂ چین تک پھیلی ہوئی تھیں۔ انہیں شاہراہوں پر علماء اور صوفیا بھی سفر کرتے تھے، وہیں کتابیں ہر جگہ مطالعہ کی جاتی تھیں اور علم کی ایک ہی زبان تھی، جو مراکش اور سپین سے وسطی اور جنوبی مشرقی ایشیا تک پڑھی اور بولی جاتی تھی۔ ان ہزاروں سالوں میں مسلم دنیا تہذیب کی رہبر تھی۔

۱۸۰۰ء میں مسلم دنیا کا زوال اس وقت شروع ہوا جب سلطنتِ عثمانیہ کو بعض علاقے روسیوں اور آسٹریا ہنگری کی مملکت کے حوالے کرنے پڑے، دو کلیدی سال تھے، ایک ۱۷۹۸ء جس میں نپولین نے مصر پر حملہ کیا اور دوسرا ۱۷۹۹ء جس میں میسور کی مسلمان سلطنت نے انگریز ولزلی سے شکست کھائی، دو اہم ناکامیاں ابتداء تھی، ایک ایسی صدی کی جس میں مسلمانوں کو پے در پے یورپ کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے۔

۱۹۰۰ء تک حالات اور بھی بگڑ گئے تھے، یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ مسلمانوں کی آخری قابلِ ذکر طاقت، ترک عثمانیہ حکومت کا بچا کھچا ڈھانچہ یورپ کی توسیعی یلغار کے سامنے

کھڑا نہ رہ سکے گا۔ ۲۰ سال کے عرصے میں یہ حکومت اناطولیہ میں اپنی بقا کی جنگ میں مصروف تھی۔ ایران پر برطانوی اثر و رسوخ کا غلبہ تھا۔ شمالی یمن، عرب اور افغانستان کو چھوڑ کر تقریباً تمام مسلم دنیا کسی نہ کسی شکل میں یورپ کی محکوم تھی، مسلم دنیا کے خواص و اشراف اسلامی علوم کی جگہ یورپی علوم کو ترقی کا زینہ سمجھنے لگے تھے، یورپ کا طرزِ زندگی اور یورپ کی سوچ مسلمانوں کے مختلف طبقوں میں سرایت کر رہی تھی۔

اکیسویں صدی شروع ہوئی تو صورتِ حال پچھلی دو صدیوں کے مقابلے میں زیادہ روشن نظر آ رہی تھی، آج تقریباً تمام مسلم معاشرے آزاد ہیں، بعض نے اپنی آزادی کو محدود ہو جانے کی کوششیں ناکام بنا دی ہیں۔ جیسے ایران اور عراق، خواص کو یہ بھی احساس ہے کہ اگر اُنہوں نے کسی صورت میں اپنی آزادی کا سودا کیا تو انہیں اس کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔ خصوصاً اسلامی شدت پسندی کی تحریکوں کی شکل میں۔ اس کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ بعض ملکوں میں ان کی آزادی اُن معاہدوں سے متاثر ہوئی ہے جو ان کے خواص نے مغربی ممالک کے ساتھ کیے ہیں۔ بعض میں ایسا محض اس اندیشے سے ہوا ہے کہ کہیں مغربی فوجی طاقت ان کے خلاف استعمال نہ ہو۔

بہت سے علاقوں میں بعض معاشرے ایک اور خطرے سے دوچار ہیں۔ مثال کے طور پر ان میں مغربی اقدار اور صافی ثقافت (Consumerist Culture) کی یلغار اتنی شدید ہے، جتنی اس سے پہلے کبھی نہ تھی۔ خصوصاً وہ جو برقیاتی (Electronic) ذرائع سے پیدا ہوئی ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ بعض معاشروں میں جہاں اسلامی شدت پسندی نے چند نازیبا حرکتیں تو کی ہیں، لیکن وہیں اس یلغار کو روکنے میں بھی ایک کردار ادا کیا ہے۔ فی الحال معاشی اور اقتصادی طاقت کی کنجی مغربی معاشرے کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے برعکس، تیل اور گیس کے بیشتر ذخائر مسلمان ملکوں میں ہیں اور مغربی ممالک اب تک وہ تباہی نہیں بھولے ہیں جو ۱۹۷۰ء کے بعد تیل کی قیمتوں میں اضافے کی وجہ سے اُنہیں سہنا پڑی تھی۔ یہ بھی ہے کہ اس وقت مغرب کو مسلم دنیا کے متعلق باقی دنیا کی رائے تشکیل دینے میں ایک بلندی کا درجہ حاصل

ہے، بلکہ یوں بھی ہے کہ خود مسلم دنیا کو اپنے آپ کو سمجھنے کے لیے مغربی معاونت کی اہمیت واضح ہے، اس کے برعکس، جمہوریت کا وہ طاقتور ہتھیار اور طاقت زمینوں کو ہموار کرنے والا آلہ، Internet، تمام مسلم دنیا میں مسلم تنظیموں کو یہ اہلیت بخش رہا ہے کہ وہ اپنا علم کھلے میدان میں بلند کریں اور اپنے مقاصد، اپنے تخیلات، اپنی تشریحات اُن لوگوں کے لیے واضح انداز میں بیان کریں جو ان کا مطالعہ کرنا پسند کریں۔ اس اہلیت سے علم اور تحقیق پر مغربی شکنجہ تو نرم نہیں ہوسکتا، لیکن یہ ایک پشتے کا کام ضرور دے سکتی ہے۔

مغرب کے اس بلند درجے کے باوجود مسلم دنیا کے متعلق مغرب کا دوہرا اور دوغلہ معیار اور بہت سی صورتوں میں صریح لاعلمی، نہایت اہم موضوع ہے۔ اکثر فلسطینیوں، کشمیریوں اور چیچن کے لیے ایک قانون ہے اور ان پر ظلم و تشدد کرنے والوں کے لیے دوسرا، اس کے باوجود یہ آثار ہیں کہ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد مغربی خیالات اور رجحانات میں یکسانیت اور یک رُخی کم ہوئی ہے۔ اب یورپ نے امریکہ کے مقابلے میں بین الاقوامی مسائل پر وضاحت سے اپنی علیحدہ رائے کا اظہار کیا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنے خیالات کی حمایت میں اپنی Rapid Reaction Force بھی استعمال کریں۔ یہ قدرتی بات ہے کہ اس فورس کو یورپ اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے استعمال کرے گا۔ یہ بھی یقینی بات ہے کہ تمام یورپی ممالک میں اس امر میں مکمل اتفاق نہ ہو کہ یہ مفادات کیا ہیں؟ اس کے باوجود، ۱۹۹۹ء میں، یورپ ہی نے کوسووو (Kosovo) میں پہل کی اور فلسطینی مسئلے پر بھی یورپ، جیسا کہ اُن کے اخبارات سے ظاہر ہے، امریکہ کے مقابلے میں زیادہ متوازن رائے رکھتا ہے۔

اس رائے کی حمایت میں کہ مسلم دنیا کی ترقی کا امکان سنہ ۲۰۰۰ء میں سنہ ۱۸۰۰ء یا ۱۹۰۰ء سے زیادہ ہے۔ بعض عوامل پر غور کرنا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ، دو مزید عوامل ایسے ہیں، جن کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ آنے والی صدی میں مسلمان ملکوں کے اثر اور رسوخ میں اضافہ ہوگا۔ پہلا تو یہ ہے کہ پچھلے پچاس سال میں مسلمانوں نے مغربی ملکوں میں اس طرح اپنی جگہ بنائی ہے جیسے عثمانیہ سلطنت کی فوجوں نے بھی کبھی نہیں کیا۔ معاشی کشمکش اور بہتر زندگی

گزارنے کی خواہش کے زیرِ اثر مسلمان بڑی تعداد میں یورپ اور شمالی امریکہ نقلِ مکانی کر رہے ہیں۔ یہ مسلمان نہ صرف اسلام اور جدیدیت کے متعلق نئے خیالات منظرِ عام پر لا سکتے ہیں جو مسلمان معاشروں کے لیے ایک خمیر کا کام دیں بلکہ ان کی موجودگی سے مغربی ممالک کی حکومتیں بھی مسلمانوں کی تشویش اور دُنیا کے متعلق اُن کے خیالات سے زیادہ متاثر ہوں، یہ بھی ممکن ہے کہ صیہونی عنصر کے اثر و رسوخ میں کمی ہو جائے۔ مثال کے طور پر یہ مسلمان ضرور بارسوخ عہدوں پر فائز ہوں گے اور اس طرح مغربی معاشرہ ان کے خیالات پر زیادہ توجہ دے گا۔ اس دوہرے عمل میں دیر لگ سکتی ہے اور اس پر قطعی فیصلہ کرنا بھی مشکل ہے۔ ایک غور طلب امر یہ ہے کہ اکیسویں صدی میں مسلمانوں کی آبادی میں اضافہ ہوگا۔ بہت سے مسلمان ملکوں میں ۲۵ سال سے کم عمر کے باشندے کل آبادی کا دو تہائی ہیں۔ جیسے کہ ۱۹۷۰ء میں ایران میں ہوا۔ عمر کا یہ تناسب انقلابی نتیجے پیدا کر سکتا ہے۔ اگر یہ نتیجے اسلامی نظریے سے منسلک ہوں تو اس سے دُنیا کے معاملات میں اسلامی خیالات کا فروغ ہو سکتا ہے۔ مسلمان جو آج دُنیا کی آبادی کا پانچواں حصہ ہیں، مستقبل قریب میں ایک چوتھائی کے قریب ہو سکتے ہیں۔ آبادی کے اس اضافے سے بہت سی مشکلیں بھی پیدا ہوں گی لیکن امکان یہی ہے کہ آنے والی صدی میں اسلام کے ماننے والوں کی تعداد عیسائیوں، ہندوؤں اور چینیوں کے مقابلے میں زیادہ ہوگی۔

اکیسویں صدی کے اس معمول سے امید افزا سیاق و سباق میں اسلام اور مسلم معاشرے کے درمیان رشتوں کے موضوع پر چند معقول سوال پیدا ہوتے ہیں۔ سب سے اوّل تو یہ اختیار و اقتدار کا مسئلہ ہے۔ اسلام کے نام پر کس کو فیصلہ کرنے کا اختیار اور حق ہے؟ انیسویں صدی تک اس موضوع پر بحث کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ یہ اختیار علماء کے پاس تھا، بے شک علماء کے درمیان اختلافات بھی تھے، لیکن تمام مسلم دنیا میں علماء کے طریقۂ تعلیم میں ایک قسم کی یکسانیت تھی، اکثر ایک ہی قسم کی کتابیں استعمال ہوتی تھیں۔ علماء ایک ملک سے دوسرے ملک سفر کرتے تھے اور ایک دوسرے سے سیکھتے تھے۔ ان کے اختلافات کے باوجود ان

کا مستقبل کا تصور مشترک تھا۔ بعض اوقات حاکم ان کی رائے سے ناخوش بھی ہوتے تھے جیسے جہانگیر اور شیخ احمد سرہندی یا صفوی شاہ، سلطان حسین اور مجلسی۔ لیکن اس معاملے میں کسی کو شبہ نہیں تھا کہ تشریح وتفسیر کا اختیار کس کا ہے۔ بلاشبہ، زبان اور مہارت کی بنا پر صرف علماء ہی کو اسلام کی تشریح کا حق تھا۔

دو تبدیلیاں، ایسی ہوئیں، جن کی وجہ سے مستند تشریح کا معاملہ بالکل بدل گیا، ایک تو وہ نمایاں فرق ہے جو اسلام میں پچھلی دو صدیوں میں مسلم حاکمیت کے زوال اور مغرب کی غالب حیثیت کے پس منظر میں پیدا ہوا۔ اس سے اصلاح اور احیاء کی تحریک پیدا ہوئی۔ عقیدے اور عمل کا دُنیا سے بے نیازی اور کسی روحانی رہبر کی وساطت سے اللہ سے رشتہ قائم کرنے کی بجائے اللہ سے کسی کے توسط کے ذریعے رشتہ استوار کرنے کو برا سمجھا گیا اور نجات حاصل کرنا انسان کے اپنے ضمیر سے منسلک کیا گیا۔ اس زمین پر انسان اللہ کا جانشین ہے۔ یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ خوفِ خدا کی بنیاد پر معاشرہ تشکیل دے۔ اقبال انسان سے اللہ کی بارگاہ میں عرض کراتا ہے: ''اللہ، تو نے رات بنائی، میں نے چراغ جلایا، تو نے مٹی بنائی، میں نے پیالہ تشکیل دیا۔'' اس طرح اسلام کی دُنیاوی ضروریات کی تاکید کی گئی۔

دوسری تبدیلی تھی، انیسویں صدی میں چھپائی کا رواج، قرآن، حدیث اور متعلقہ علوم کا مقامی زبانوں میں ترجمہ، تعلیم کی توسیع، اس طرح اسلام کے مآخذ ہر شخص کو حاصل ہونے لگے۔ اور تشریح وتفسیر پر علماء کی اجارہ داری ٹوٹ گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں نے زیادہ تعداد میں علماء کے فتوے پر بھروسہ کرنے کی بجائے اپنا دین خود سمجھنے کی کوشش کی۔ اجتہاد عام لوگوں کو میسر آ گیا۔ ان میں وہ اسلام پسند بھی شامل تھے، جن کی تعلیم علماء کے مدارس کے باہر ہوئی تھی۔ مسلمانوں نے اپنی آواز صرف مدارس سے ہی نہیں بلکہ معاشرے کے ماحول میں بلند کرنی شروع کی، جیسا کہ اقبال نے اشارہ کیا ہے۔ اب اجماعِ علماء کی بجائے عوام کے پاس آ گیا، پچھلے پچاس سال میں اس تاریخی تبدیلی سے یہ سوال پیدا ہوا کہ اس صورتِ حال میں اس تبدیلی کو حکومت کے اداروں کے ذریعے کیسے عمل میں لایا جائے۔ جیسا کہ پاکستان کے آئین

کی تبدیلیوں کی مثال سے واضح ہوتا ہے، پاکستان میں اور پاکستان سے باہر یہ موضوع آنے والی صدی میں لوگوں کی ہمت اور جستجو کا مرکز بنا رہے گا۔

دوسرا اور پہلے سے منسلک موضوع استناد، بھروسے اور اعتبار کا ہے۔ شروع ہی سے جب مسلمانوں نے دیکھا کہ وہ یورپ کے محکوم ہو گئے ہیں یا یورپ ان کا رقیب بن گیا ہے تو ان کو یہ تشویش لاحق ہوئی کہ وہ یورپی تہذیب کی کونسی باتیں اپنا سکتے ہیں، جس سے وہ نہ تو نقالی کا گناہ کریں اور نہ ہی اسلام کی رُوح قربان ہو، لہٰذا انیسویں صدی میں ہی مسلمان یہ غور کر رہے تھے کہ کیا یورپ کے کھانے اور لباس کے طریقے، تصویریں کھینچنے اور مسجدوں میں بجلی استعمال کرنا ان کے لیے صحیح ہے یا نہیں۔ کیا اس بات کی اجازت ہے کہ وہ کوئی یورپی زبان جیسی انگریزی، سیکھیں؟ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، مسلمانوں نے اپنی اس تشویش کا حل نکال لیا اور ان کی توجہ زیادہ بنیادی مسئلوں پر مرکوز ہوگئی۔ مثلاً کیا جمہوریت کی یورپی شکل قبول کرنا ممکن تھا، جب کہ اس میں عوام کی حاکمیت لازمی تھی اور مسلمان صرف اللہ کی حاکمیت میں ایمان رکھتا ہے، کیا مغربی قوانین اور قانونی ضابطے نافذ کرنا ممکن ہے جب کہ مسلمانوں کے لیے اللہ کے احکامات موجود ہیں؟ کیا مغربی معاشی نظام اپنانا ممکن ہے جو شریعت کے احکام کے منافی ہے؟ کیا علم حاصل کرنے کے مغربی انداز مناسب ہیں، جن کی بنیاد اسلامی اقدار سے غیر متعلق ہے؟ کیا انسانی حقوق کا مغربی اندازِ فکر نافذ کرنا ممکن ہے، جب کہ وہ بھی صریحاً ہر اسلامی مقصد سے خارج ہے؟ جب سے مسلمانوں نے مغربی تسلط سے سیاسی آزادی حاصل کی ہے۔ ان کی تمام تر کوششیں استناد کے ان موضوعات کا حل تلاش کرنے میں لگی ہیں، قابلِ اعتبار ترقی کے سیکولر (Secular) اور مذہبی مستقبل کے تصورات کے درمیان ایک مکالمہ جاری ہے۔ بیسویں صدی کے تین عظیم انقلاب، روس اور چین کے علاوہ ایرانی انقلاب کے مستحکم ہونے پر یہ واضح ہو گیا ہے کہ جدیدیت کا ایک کامیاب اسلامی تصور ممکن ہے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ ایرانی انقلاب سے تمام مسلم دنیا میں اسلامی تحریکوں کی ہمت افزائی ہوئی اور ترقی کے سیکولر حامیوں کو دھکا لگا، البتہ یہ بھی صحیح ہے کہ ایرانی نظامِ حکومت کے اندر جو کشمکش جاری ہے، اس سے یہ حقیقت عیاں

ہوتی ہے کہ جدید اسلامی معاشرہ تشکیل دینے کے طریقوں پر وہاں کافی اختلافات ہیں، آنے والی صدی میں معتبر، مستند اور اسلامی جدیدیت کا موضوع تمام مسلم دنیا میں اہم ترین مسئلہ رہے گا۔

اس مسئلے کے ساتھ ساتھ کہ مسلم معاشرے کس نظام کو مستند سمجھتے ہیں، ایک تیسرا موضوع ہے جو اس مسئلے سے جڑا ہوا ہے۔ یعنی وہ کشمکش جو تمام مسلم دنیا میں اسلام ''پرست'' جن کی طاقت کی بنیاد شہری اوسط درجے اور کم اوسط درجے کے طبقے پر منحصر ہے اور اشراف و خواص جو عموماً نوآبادی نظام کے وارث اور اکثر (ہمیشہ نہیں) مغرب سے قربت کی بنا پر طاقت اور وسیلے حاصل کرتے ہیں، کے درمیان جاری ہے۔ یہ بھی غور طلب ہے کہ ان اسلامی گروہوں کی رہبری مغرب کے تعلیم یافتہ پیشہ ورانہ اہلیت کے لوگ کرتے ہیں اور ان کا انتظام یونیورسٹی کے طلبہ کے پاس ہے، انہوں نے وہ خلا پر کیا ہے جو مقامی سطح پر شہروں اور قصبوں میں حکومتی نظام کی ناکامی سے پیدا ہوا ہے۔ شہری آبادی میں جو انتشار جدید ریاستی نظام اور بین الاقوامی معاشیات سے پیدا ہوا ہے، اس سے نمٹنے اور اس آبادی کی ضرورتیں ایک حد تک ان گروہوں نے سکول، شفاخانے، بہبود کے مرکز اور نفسیاتی امداد مہیا کر کے پوری کی ہیں۔ نواحی علاقوں سے جو لاکھوں لوگ شہروں کی طرف آئے ہیں، ان کے لیے بھی ان گروہوں نے کشش پیدا کی ہے۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ ان تحریکوں کی تقریریں اور خطبے مغربی ثقافت اور مغربی طاقت کی سخت مخالفت سے پُر ہیں۔ ان کا مقصد سرمایہ داری یا اشتراکیت (Socialism) کے مقابلے میں اسلامی نظام قائم کرنا ہے اور وہ اپنا مقصد طاقت پر قبضہ جمانے کے ذریعے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ایران اور سوڈان میں اسی طرح کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں۔ آنے والے عشروں میں اسلامی گروہوں اور ان کے مدِ مقابل خواص کے درمیان کشمکش کی کہانی سامنے آئے گی۔ اس کشمکش کے نتیجے میں ہی اس مستند اور معتبر شکل کا فیصلہ ہوگا جو سیاسی نظام اپنائے گا۔ یہ اُمید کرنی چاہیے کہ ایرانی انقلاب کے بعد مغرب نے سبق سیکھ لیا ہوگیا اور وہ خواہ مخواہ ایسی صورت میں مداخلت نہیں کریں گے جہاں نئی اسلامی ریاستیں وجود میں آ جائیں۔ البتہ اگر اس قسم کی

تبدیلی سعودی عرب میں آ جائے جس کا لازمی اثر خلیج کی ریاستوں پر بھی ہوگا۔ تب تک اُمید افزا ہونا ممکن نہیں ہوگا۔ سعودی عرب اور خلیجی ریاستوں کے وسائل دنیا کی معیشت کے لیے مرکزی اہمیت کے ہیں اور کوئی بھی اس بات کی ضمانت نہیں دے سکتا کہ مغرب، خصوصاً امریکہ، میں دانشمندی کا مظاہرہ ہوگا۔

لیکن اگر ایسا ہو بھی جائے تب بھی یہ ضمانت نہیں دی جا سکتی کہ اسرائیل دانشمندی کا مظاہرہ کرے گا کیونکہ اس کے لیے اس قسم کی تبدیلی اس کی نظر میں اس کی سالمیت کے لیے ایک خطرہ ہوگی۔

مسلم معاشرے میں اسلامی تحریکوں کی توسیع سے چوتھا موضوع سامنے آتا ہے:
مسلم معاشرے میں عورت کا مقام، احیائے اسلام اور مغرب کے اقتدار کی پچھلی دو صدیوں میں معاشرے میں عورت کا صحیح مقام اور کردار گرما گرم بحث کا موضوع بنا رہا ہے۔ غیر ملکی تسلط کے دوران، جب مغربی اقدار تمام ماحول پر چھائی ہوئی تھیں، تو مدرسوں، مزاروں اور مسجدوں کے باہر جو علاقہ بچا تھا، اس میں مسلمان عورتیں اپنے گھروں کی چار دیواری میں اسلامی طرزِ زندگی کی مالک بن گئیں۔ یہی وجہ تھی کہ مولانا اشرف علی تھانوی نے ان کی ہدایت کے لیے بہشتی زیور لکھی تاکہ عورتوں کو اسلام کے متعلق اتنا علم ہو کہ وہ اپنے اور اپنے کنبے کے لیے اسلامی معیار قائم رکھ سکیں۔ جب بعض مسلم حکومتوں نے جیسے مصطفیٰ کمال کے ترکی اور رضا شاہ پہلوی کے ایران میں سیکولر طرزِ زندگی اپنانے کی کوشش کی تو عورتیں تبدیلی کا نشان اس طرح بن گئیں کہ اُنہیں ماحول میں حجاب سے روکا گیا۔ اور جب اسلامی حکومتیں وجود میں آئیں تو عورتوں پر حجاب کی پابندی عائد ہوگئی۔ لیکن بنیادی اسلام بھی جدید معاشی نظام اور ریاستی تنظیم میں عورت کا اپنا مقام حاصل کرنے کے خلاف نہیں ہے۔ ہر چند کہ الجیریا میں اسلامی جماعت (FIS) عورتوں کے گھر سے باہر کام کرنے کے خلاف ہے اور ایرانی انقلاب کے فوراً بعد عورتوں کو سرکاری دفتروں سے گھر بھیج دیا گیا تھا۔ وہ اسلامی اقدار جو اسلامی تحریکیں پھیلا رہی تھیں، ان کا تقاضا یہی تھا کہ عورتیں اپنے گھر سے باہر آزادی سے حرکت کریں اور جدید معاشی نظام میں کام

کریں۔ آج کل جو شخص بھی ایران، خصوصاً تہران جاتا ہے، اس سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ عورتیں معاشی نظام میں ہر سطح پر کافی تعداد میں موجود ہیں۔ اس میدان میں دلچسپ امکانات ہیں، مسلم معاشروں کا علم کی بنیاد پر معاشی نظام کی تشکیل سے فرار ممکن نہیں ہے اور اس کے لیے انہیں تمام آبادی کی ذہنی صلاحیتوں کی ضرورت ہوگی، آدھی آبادی اس سے خارج نہیں ہوسکتی۔ ان کے لیے لازمی ہوگا کہ عورتیں پوری طرح سے اس میں حصہ لیں، اسلامی تحریک کے حمایتی ضرور اس ترقی کی شرائط طے کریں گے اور ان کو اس میں آسانیاں بھی پیدا کرنی ہوں گی۔ یہ بات قابلِ بحث ہے کہ یہ اسلامی اشخاص ایک ایسے عمل میں امداد کریں گے جن میں عورتوں کی مخصوص ضروریات اور ان کی ترجیحات میں وسعت پیدا ہوں۔ اسلام میں عورتوں پر زیادہ تحریر وتقریر کے امکان پر نظر رکھیے، اسلامی نسوانی تحریک (Feminine) پر نظر رکھیے۔

احیائے اسلام کی جاری اثر ورسوخ اور توسیع کی وجہ سے اکیسویں صدی کے سامنے ایک اور موضوع اُبھرتا ہے جس میں ایک قسم کا طنز پوشیدہ ہے: انفرادیت اور قوم کے مطالبات کے درمیان کشاکش، جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے، اٹھارہویں صدی کے اواخر سے احیا اور اصلاح کا مقصد، مسلم طاقت کے تناظر میں، قوم کو نیچے سے اُبھارنا تھا، ہم نے یہ بھی دیکھا کہ اس کا طریقِ کار یہ تھا کہ ہر مسلمان فرد کے ضمیر پر یہ ذمہ داری ڈالی جائے کہ وہ ایک اسلامی معاشرہ تشکیل دے اور اس کے لیے ہر مرد اور عورت کو اتنی تعلیم دی جائے کہ وہ یہ ذمہ داری پوری کرنے کا اہل ہو جائے۔ ذاتی ذمہ داری کو اتنی اہمیت دینے سے چند غیر متوقع نتیجے رونما ہوتے ہیں۔ اس سے خود انحصاری کی ہمت افزائی ہوتی ہے۔ اس نظریے کی کہ ہر فرد بہ ذات خود ایک فعال، تخلیقی نمائندہ ہے۔ اس نظریے کی یہ بھی مانگ ہے کہ مرد اور عورتیں آزادی سے خود فیصلہ کرنے کی مجاز ہیں۔ اس بات کی تاکید کہ عام دنیاوی زندگی میں جن باتوں کی قدر و قیمت ہے۔ جیسے کنبہ، رشتے، احساسات، جنسی تعلقات، ان میں اپنا کردار خود ادا کرنا، اس بات پر زور کہ خود اعتمادی اور غور وفکر کے ذریعے ہر ذمہ دار مسلمان کو اپنے اعمال کا اس لیے جائزہ لینا ہے

کہ وہ کس حد تک اللہ کی ہدایتوں پر عمل کر رہا ہے۔ یہ دلیل دی جا سکتی ہے کہ یہ تبدیلیاں جو احیاء کے عمل سے رونما ہوئی ہیں، مسلمانوں میں انفرادیت کو سہارا دے رہی ہیں۔ ایک احساس ہے طاقت کا، جو اس علم سے پیدا ہوتا ہے کہ یہ دُنیا انسانیت سے تشکیل پاتی ہے، وہ احساس جو ذاتی آزادی اور انفرادی امکانات کے ساتھ اس علم سے پیدا ہوتا ہے کہ فرد خود انتخاب کرتا ہے، زندگی کے اصل معنی اور اس کے نشانات... اور غور و فکر سے خودی کی ترقی میں ایک اضافی اہمیت پیدا ہوتی ہے۔ انسانی تکمیل کے امکانات وسیع ہوتے ہیں اور انفرادی راستہ اختیار کرنے کا تصور زیادہ واضح ہوتا ہے۔

لہٰذا طنز یہ ہے کہ احیائے اسلام نے جو قوم کو جگانے کی تحریک تھی، ان خیالات اور رویوں کی ہمت افزائی کی جو قوم کو للکار رہے تھے، اس میں ترقی کا اور بھی امکان ہے اگر مسلم معاشروں میں سرمایہ داری نظام زیادہ آزادی سے کام کرے، آنے والے عشروں میں ہمیں یہی توقع کرنا ہوگی کہ احیائے اسلام کی دُنیاوی شکل کا سہارا لیے ہوئے، انفرادیت کی قوت اور ملتِ اسلامی کی اقدار کے درمیان زیادہ کھچاؤ پیدا ہوگا۔ اس کے علاوہ، اس بات کے پیشِ نظر کہ احیاء کی توقعات کا زیادہ خمیازہ عورتوں کے حصے میں آتا ہے، تو یہ کھچاؤ بھی ان کے لیے زیادہ پریشان کن ہوگا۔

تو، یہ ہیں وہ پانچ نمایاں موضوع جن سے مسلم معاشرے کو آنے والی صدی میں نمٹنا ہوگا، پہلا، اللہ کی ہدایت کی تعبیر و تشریح کا اختیار، دوسرا مسلم معاشروں کے لیے صحیح راستہ مقرر کرنے میں استناد کا مسئلہ، تیسرا طاقت کے حصول کے لیے ''اسلام پرستوں'' اور نوآبادی نظام کے وارثوں میں مقابلہ، چوتھا معاشیات اور ریاست کی ترقی میں عورتوں کا کردار، پانچواں بڑھتی ہوئی انفرادیت اور ملتِ اسلامیہ کی اقدار میں کشمکش۔

پچھلی دو صدیوں میں مسلم معاشروں کو انہی اہمیت کے مسئلوں سے نمٹنا پڑا تھا۔ یا تو نوآبادی نظامِ حکومت کی پابندیوں کے ماحول میں اور یا نوآبادی نظام کے خاتمے کے فوراً بعد مداخلتی پدرانہ نظام میں، تجربے یا آزاد خیالی کے لیے یہ بالکل خوش آئند حالات نہیں تھے۔

خوف زدہ لوگ تعمیری یا تخلیقی خیالات کے اہل نہیں ہوتے۔ اکیسویں صدی میں بہ ظاہر مسلم معاشروں کو تجربے کرنے کے لیے زیادہ آزاد ماحول حاصل ہوگا، یہ تو ایک نیک شگون ہے۔

☆☆☆

بہ شکریہ ماہنامہ ''ہیرلڈ'' (Herald)، کراچی، سالنامہ (جنوری ۲۰۰۱ء)